ترقّی پسند ادبی تحریک اور اس کے اثرات

اردو میں ترقّی پسند ادبی تحریک نے پہلی بار ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو ایک مقام پر جمع کر کے ان کے ادبی اعتقادات کی قومی اور بین الاقوامی ترجمانی کا خواب دیکھا تھا۔ ان معنوں میں یہ پہلی تحریک تھی جس کے پیچھے ارادوں کا دخل ہو۔ اِس کے قبل اردو میں جو تحریکیں سامنے آئیں، وہ غیر ارادی طور پر ابھر گئی تھیں۔ ایہام گوئی، اصلاحِ زبان، فورٹ ولیم کالج۔ ان تینوں تحریکوں میں اس زمانے کے لکھنے والوں کے اجتماعی ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ علی گڑھ تحریک ادبی فروغ کے مقصد سے نہیں کھڑی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ مانا جا سکتا ہے کہ یہ بھی اپنے آپ پیدا ہوئی ادبی تحریک بن گئی لیکن ترقّی پسند تحریک دنیا بھر میں مخصوص مقاصد اور نشانوں کو نظر میں رکھ کر شروع کی گئی تھی۔

اردو میں جب اس تحریک کا آغاز ہو رہا تھا، اُس وقت بھی اس کے اغراض و مقاصد واضح تھے۔ ہندستان کی قومی تحریک سے بھی ترقّی پسند تحریک نے ربط باہمی کا سلسلہ رکھا اس لیے فوری طور پر یہ اپنی مقبولیت کے عروج تک پہنچ گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ 1950 کے بعد اِس تحریک نے زوال کی طرف رُخ کیا اور اُسی دہائی میں جدیدیت کے فروغ کے پہلے اِس نے اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا۔ اس کے باوجود بعد کے ادب میں بھی ترقّی پسندانہ نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ ادب کے طالب علم کے لیے یہ سوال کافی اہم ہے کہ اس تحریک کے زیرِ اثر لکھے جانے والے ادب کا جائزہ لے کر یہ طے کیا جائے کہ واقعتاً ہمیں اس تحریک نے کیا دیا؟ اِسی سوال کا دوسرا منطقی پہلو یہ ہے کہ اُن امور کی نشاندہی کی جائے کہ ترقّی پسندی جن تصوّرات اور نظریوں کو لے کر آگے بڑھی تھی، کیا اردو پر ان کے دائمی اثرات مرتّب ہوئے؟ ترقّی پسند ادیبوں اور شاعروں نے جو نئے تجربے کیے، کیا انھیں بعد کی نسلوں نے اپنے لیے رہنما تصوّر کیا؟ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ترقّی پسندی آج بھی اردو ادب میں رویّے کے طور پر زندہ ہے تو یہ سوال اہم ہو جاتا ہے کہ موجودہ ادبی سرمائے کے تناظر میں بھی ترقی پسندانہ تصوّرات کی موجودگی کا محاسبہ کیا جائے۔

اردو میں ترقّی پسندی اوّلاً اقبالؔ، پریم چند اور انگارے کے افسانہ نگاروں کے طفیل اپنی بنیاد استوار کرتی ہے، ترقّی پسندی کے بڑے سوالات انھیں لوگوں نے ابتداً اٹھائے تھے۔ اقبالؔ نے عالمی تناظر، مذہبی اداروں کے خلاف ردِ عمل اور ادب، سیاست، مذہب میں رشتے کی بات سامنے لا دی تھی۔ پریم چند نے کسان اور مزدور کی مرکزیت، دیہی سماج اور شہری سماج کے مناظرے، زبان کی سطح پر عوام کی طرف جھکاو اور کمزور لوگوں کی طرف داری جیسے بالکل نئے سوالات ہندستانی ادب میں قائم کیے۔ 'انگارے' کے مصنّفین نے آزادیِ اظہار، عورت اور مرد کے رشتوں کی وضاحت اور آزادیِ نسواں جیسے اہم معاملات کو

مرکزیت عطا کر کے ادبی آسمان کو مزید وسیع کرنے کا خواب دیکھا تھا۔

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک انھیں بنیادوں پر قائم ہوئی۔ مختلف اصناف میں اہم لکھنے والوں کی بہترین نگارشات کے دائرۂ کار کا واضح تعین کیا جائے تو بہت کم ان سے الگ نوعیت کے سوالات کھڑے ہوں گے۔ بعد کے ادبی سرمائے پر غور کریں تو یہ موضوعات مزید اہمیت حاصل کر لیتے ہیں کیوں کہ ان میں سے بیش تر کی موجودگی جدیدیت اور مابعد جدید دونوں زمانے میں رہی۔

ادبی اور سماجی موضوعات پر اردو کے علمی حلقے میں نرم گرم بحثوں کا جو سلسلہ ہنوز قائم ہے، اس کی پشت پر ترقی پسندوں کی گہری تربیت کا اثر ہے۔ 1936 سے 1950 تک ادبی رسائل میں جو گہما گہمی رہی، وہ ترقی پسندی کے ختم ہونے کے باوجود کبھی زائل نہیں ہوئی۔ ادب کیسا ہو، کس طرح لکھا جائے اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کی ضرورت اور افادیت کیا ہے، اِن جیسے سوالوں پر ترقی پسندوں نے آر پار کی جو بحث شروع کی، وہ ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ جدیدیت کے دور میں اور مابعد جدید زمانے تک ان سوالوں پر صرف بڑے لکھنے والوں کے جوابوں پر اطمینان کر کے بیٹھ جانے کا رویہ آج ادبی سماج میں نہیں ہے بلکہ ایک معمولی اور ادبی اعتبار سے غیر اہم لکھنے والا بھی ان سوالوں پر اپنی انفرادی رائے دینا چاہتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے ادب کو انسان کی سماجی توقعات کا اشاریہ مانا تھا۔ اسی سے ادب اور زندگی کے گہرے رشتوں کی وضاحت ہو سکی۔ جدیدیت کے زمانے میں حالاں کہ ''ادب برائے ادب'' کو ترجیح دینے کی کوشش ہوئی لیکن رفتہ رفتہ سبھی جدید اہلِ قلم ادب کے سماجی انسلاک کو تسلیم کرنے والے بنے۔ آج جدید اور مابعد جدید تحریروں میں تہذیب و ثقافت اور سماجی مسائل کو بنیادی اہمیت کا حامل تصوّر کیا جاتا ہے تو اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جائے کہ ترقی پسند تحریک نے جو سوالات اٹھائے تھے، وہ اب معدوم ہو چکے ہیں۔

ترقی پسندوں کو پریم چند کی زراعتی سوسائٹی روایت میں ملی تھی لیکن راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی کو چھوڑ کر دیہاتی سماج کو مرکزیت دینے میں بقیہ لکھنے والوں نے کچھ خاص سرگرمی نہیں دکھائی۔ ترقی پسندوں نے ایک ابھرتے ہوئے شہری تمدّن کی طرف آنکھ لگا رکھی تھی۔ آج ہندستان رفتہ رفتہ شہری سماج بنتا جا رہا ہے۔ نئی آبادیوں اور شہروں کے مزاج سے اردو کا اس کی پیدایش کے وقت سے ایک گہرا تعلّق ہے۔ ترقی پسند اہلِ قلم نے اردو کی اس بنیادی سرشت کو پہچانا اور اپنے ادب میں شہری سماج پر خاص توجہ دی۔ گذشتہ نصف صدی میں شہری تہذیب و تمدّن کے مظاہر اردو میں سب سے زیادہ آئے۔ اگر دیہات اور شہر کے تنازعے میں ترقی پسند ادیبوں نے واضح فیصلہ نہیں کر دیا ہوتا تو بعد کے لکھنے والوں کے لیے یہ آسان نہیں تھا کہ کسی ایک طرف ہو جائیں۔ ترقی پسند تحریک کا ہی یہ اثر ہے کہ موجودہ اردو ادب شہری تہذیب و تمدّن کا عکاس بنا ہوا ہے۔

ہندستان ایک روایتی اور مذہبی سماج رہا ہے جہاں عورتوں کی تعلیم اور ان کے سماجی رول پر بہت دیر سے ہمدردانہ رائے قائم ہوئی۔ لیکن ہندستان کی کسی زبان سے پہلے اردو میں روایتی اور جدید دونوں قسم کی عورتیں سامنے آتی ہیں۔ انیسویں صدی میں اردو کی ادیبہ رشیدۃ النّسا نے اس زمانے میں ''اصلاح النّسا'' کے نام سے ناول لکھا جب کتابوں پر مصنّفہ کی حیثیت سے

عورتوں کے نام نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ 'انگارے' میں جب رشید جہاں کا افسانہ اور ڈراما شامل کیا گیا، اس وقت بھی عورتوں کے تعلق سے ہندستان کا سماجی ماحول کچھ خاص بدلا ہوا نہیں دکھائی دیتا لیکن رشید جہاں بالکل ایک نئی دنیا کی خاتون ہیں۔ 1942 میں عصمت چغتائی جب 'دوزخی' اور 'لحاف' لکھتی ہیں تو انھیں محبت سے ''لیڈی چنگیز خاں'' تک کہا گیا۔ ان کے افسانوں پر مقدمے قائم ہوئے اور گھر کی چہار دیواری میں قید رہنے والی عورت عدالت کے کٹہرے تک پہنچی۔

ترقی پسند تحریک کے تمام کام اگر وقت کی رَو میں ختم ہو جائیں اور صرف اردو کے ادبی منچ پر عورتوں کی طاقت ور شراکت قائم رہ جائے تب بھی ترقی پسند تحریک کے اثرات شاید ہزاروں سال رہیں۔ آج اس پر شاید ہی اختلاف ہو کہ اردو کی سب سے بڑی مصنفہ قرۃ العین حیدر تھیں۔ یہ بدلی ہوئی صورت ترقی پسند تحریک کا احسانِ عظیم ہے۔ آج اردو کی ادیبہ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید عالمی خواتین کانفرنس اور اقوام متحدہ کے مختلف پروگراموں میں نمایندہ بن رہی ہیں تو کیا اسے ترقی پسندوں کی صالح تربیت کا نتیجہ نہیں مانا جائے؟

آزادی کے بعد اردو لکھنے پڑھنے والوں میں مسلمانوں سے الگ دوسری مذہبی آبادیوں نے حصہ لینا کم کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ زبان مسلمانوں کے حلقے میں سمٹ آئی۔ اس کے باوجود مشترکہ تہذیبی وراثت کے موضوع سے اس کے خمیر میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا۔ ترقی پسندوں نے اگر غیر مذہبی بنیاد پر شعر و ادب کی تفہیم کے لیے ماحول قائم نہیں کیا ہوتا تو شاید آج اردو فرقہ واریت کی نقیب بن جاتی۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ترقی پسند تحریک کی اٹھان اور جارح قومیت (فرقہ واریت) کی شعلگی ایک ہی زمانے کی چیزیں ہیں۔ اگر ترقی پسندوں نے ادب اور سماج کے ان سوالوں پر دور اندیشی سے کام نہیں لیا ہوتا تو آج ہم ایک بدلی ہوئی صورتِ حال سے دوچار ہوتے۔ مذہبِ اسلام کے نام پر ادبی روایتوں اور تحریکوں کی جو کوششیں بیچ بیچ میں ہوئی ہیں، انھیں اردو عوام نے نہ کبھی اہمیت دی اور نہ کبھی زور پکڑنے دیا۔

ترقی پسند تحریک نے اپنے زمانے کی سیاسی اور سماجی تحریکوں کے ساتھ تعلق قائم کیا تھا۔ قومی تحریک کے آغاز کے بعد تلنگانہ، نکسل باڑی آندولن اور ملک بھر میں چل رہیں تحریکیں اردو کے موجودہ ادب کو متاثر کر رہی ہیں۔ آج کے افسانے اور ناول اِس کے بہترین آئینہ دار ہیں۔ ہندستان کی دوسری زبانوں میں بھی جو تحریکی اور انقلابی ادب لکھا جا رہا ہے، اہلِ اردو نے اس کا اچھا خاصا ترجمہ کر رکھا ہے۔ ترقی پسندوں نے اگر ہماری تربیت نہ کی ہوتی تو شاید ہی اس طرف ہماری نگاہ جاتی۔

ترقی پسند تحریک کے زمانے میں ہی پہلی بار اردو ادب نے عالمی سطح پر اٹھ رہے سوالات کو مرکزِ نگاہ بنایا۔ اس کے پہلے تک اردو اور اہلِ اردو اپنے ہی مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ آج دنیا کے اہم اور غیر اہم، سماجی، سیاسی اور مختلف طرح کے سوالات پر شعر و ادب اور دوسرے منچوں پر اردو کے لکھنے والے اپنی دانشورانہ رائے پیش کرتے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان میں جب نیوکلیر ٹسٹ ہوتے ہیں تب انتظار حسین کی کہانی، انور سجاد کا مضمون اور درجنوں ادیبوں کے ردِّ عمل کے ساتھ ماضی میں دوسری جنگ عظیم اور 1942 کی تحریک کے تعلق سے ترقی پسند ادیبوں کا ردِّ عمل یاد رکھنا چاہیے۔

ترقی پسند ادبی تحریک نے ادب کا دروازہ کشادہ کیا، ادیبوں کی سماجی اہمیت اور ان کی رائے کے اعتبار کو بڑھایا، ایک

چھوٹے جغرافیائی خطّے یا بند کمرے سے نکال کر اردو لکھنے والوں کو عالمی شہری بنایا۔ اپنے زمانے کے مسائل پر بے باکی اور ضرورت پڑنے پر برہمی کے ساتھ بھی رائے دینے کا سلیقہ عطا کیا۔ ادب یا ادیب کوئی حاشیے کی چیز نہیں ہیں۔ سماج میں ان کی اہمیت افکار و نظریات کے بنانے والوں کی ہے۔ اس لیے ان کے تئیں اہلِ اقتدار کا رویّہ بھی مناسب ہونا چاہیے۔ ادب اور شاعری معروضی بنیادوں پر فروغ پاتے ہیں، انھیں تنگ نظری سے کوئی علاقہ نہیں۔ ترقّی پسند تحریک نے جو یہ سارے سوالات اپنے زمانے میں قائم کیے، وہ آج بھی اردو کی رگ و پَے میں موجود ہیں۔ کہنا چاہیے کہ اردو نے ان امور کو اپنی روح کا حصّہ بنالیا۔ اس لیے ترقّی پسند تحریک کے گوناگوں اثرات اور احسانات سے انکار کرنا حقائق سے چشم پوشی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اردو کا موجودہ ادب بھی ترقّی پسندوں کے بعض بنیادی راستوں پر چل رہا ہے اور آیندہ بھی ایسے امکانات نظر نہیں آتے کہ اردو اس راستے سے الگ ہوگی۔